لیلیٰ پلٹ کر بولی ——— " ہائے اماں یہی تو کلفٹن کا حسن ہے ——— "

" میل بھر تو یہ سیڑھیاں ہی ہوں گی ——— " اماں نے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔

" بھلا سیر کیا رہ جاتی ہے جب ٹانگیں ہی تھک جائیں ——— "

زرقا نے آہستہ سے مجو کو کہا ——— " پتہ نہیں آپ کے کندھے پر کالی سی کیا چیز لگی ہے ——— "

مجو نے اپنے کندھے پر چپکے ہوئے خزاں آلود پتے کو اتار کر تشکر آمیز نظروں سے اُسے دیکھا اور شیریں سے کہنے لگا ——— " ہماری فکر تم کو نہیں ہے شیریں صاحبہ! لیکن یاد رکھیئے مٹھائی کے ہم ہی وارث ہیں۔"

" توبہ یہ بچیاں ابھی تک کبوتروں کے پاس ہی کھڑی ہیں۔ ان کی تو ساری شام کبوتروں کے ساتھ ہی کٹ جائے گی ——— لکو اور ——— رانی" اماں جی چلائیں۔

زرقا سانس لینے کے لئے جنگلے کے ساتھ کمر لگا کر رک گئی تو لیلیٰ نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نعرہ لگایا ——— " مجو بھائی کیمرہ نہیں لائے آپ؟"

" نہیں تو ——— "

اس نے اور حبیب میرزا نے بیک وقت زرقا پر نظر ڈالی۔ اس کا جسم دیوار کے کنگرے اور کٹاؤ کے ساتھ یوں بل کھا گیا تھا جیسے اس میں کوئی ہڈی نہ ہو۔ مجو نے چہرہ پرے کر لیا اور اس کا بند بند دُکھنے لگا۔

زرقا نے برقعے کے بٹن کھول رکھے تھے اور سیاہ بادبان کے کنارے اس کے سفید چہرے کے گرد پھڑپھڑا رہے تھے۔ کالی اور گرے دھاریوں والی قمیص ہوا کے باعث اور بھی جسم سے چمٹ گئی تھی اور رسی نما چنت کا دوپٹہ گلے میں یوں لٹک رہا تھا جیسے موتیے کا لمبا ہار ہو۔

" حبیب میاں ذرا ان بچیوں کے کان کھینچ کر لاؤ بدبختیں جب آتی ہیں۔

کبوتروں کے پاس ہی رہ جاتی ہیں" حبیب نے ایک نظر پھر زرقا پر ڈالی اور الٹے پاؤں ککو اور رانی کو لینے واپس چلا گیا۔

کوئی فرلانگ بھر لمبی بتدریج اترتی سیڑھیوں کا سلسلہ ختم ہوا اور وہ ہوادار دالان میں پہنچے تو ابھی حبیب میرزا اور بچیاں پہلی سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔ اس دالان میں دونوں جانب بنچیں پڑی تھیں اور بائیں ہاتھ چند ایک مچھیرے بیٹھے اپنے جال مرمت کر رہے تھے۔ سامنے سمندر تھا سمندر کی ریت تھی ریت کی لہریں تھیں۔

زرقا اس دیوار کے پاس جا کھڑی ہو گئی جو عین سمندر کی جانب تھی اماں جی بنچ پر بیٹھی سانس درست کر رہی تھیں لیلیٰ اور شیریں زرقا کے پاس پہنچیں اور دیوار پر سے نیچے جھانک کر ان میں سے ایک نے کہا ——— "آؤ آپا سیپیاں اور گھونگھے دیکھیں ———"

مجو مٹھائی کا لفافہ سنبھالے کچھ ہی دور کھڑا تھا۔ اس نے سوچا زرقا ان دونوں سے کچھ ایسی بڑی تو نہیں لیکن پھر بھی وہ ہمیشہ الگ تھلگ رہتی ہے گویا کچھ سوچ رہی ہو۔ ڈار سے بچھڑی ہوئی کونج فضا کی پنہائیوں میں اکیلی غوطہ زن ہو ——— یونہی اسے خیال آیا اگر زمانے کے انقلاب نے اسے میری بیوی نہ بنایا اور یہ حبیب میرزا کی دلہن بن گئی تو ——— تو شاید یہ کونج پھر کبھی ڈار سے نہ مل سکے گی۔ اس کا ساتھی اس سے دور دور اڑا کرے گا اور یہ پھڑپھڑاتی سینہ پھلاتی ہانپتی کانپتی اس سے پرے پرے اڑتی رہے گی۔ اڑتی رہے گی اور ایک دن اس کے پر جواب دے جائیں گے اور یہ دھرتی کے کسی بے آب و گیاہ علاقے میں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائے گی تنہا ——— اکیلی بے یار و مددگار ———!

کلفٹن کا ریتیلا ساحل کافی لمبا اور بہت چوڑا ہے۔ سمندر بڑی ہی سست رفتاری سے ساحل کے قدم چومنے آتا ہے اور ہلکے سے لمس کے بعد لوٹ جاتا ہے۔ یہاں منوڑا کی مستانہ لہروں کا شور نہیں یہاں دور دور تک پھیلی ہوئی استراحت کرتی ابرق جیسی ریت ہے۔ اس ریتیلے ساحل کنارے کچھ چائے کے سٹال ہیں کچھ پینے کے لئے بوسیدہ میز ہیں پرے تختوں پر سمندر کے گھونگھے سیپیاں سنکھ اور خوبصورت پتھر بکتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے گھونگھوں کی مالائیں، گجرے، کان پھول، چھوٹے چھوٹے شیشے کے بکسوں میں جگمگا رہے تھے۔

مجو شیریں اور لیلیٰ کے ساتھ جا کر کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا ——— انسان کس قدر زبردست واقع ہوا ہے۔ جو تحفے سمندر کی لہریں لا کر ساحل کنارے چھوڑ جاتی ہیں انسان نے ان کی بھی قیمتیں مقرر کر دی ہیں۔

لیلیٰ نے ٹوپس کی ایک سفید جوڑی ہتھیلی پر رکھ کر شیریں سے کہا۔ "ہائے یہ بالکل نیا نمونہ بنایا ہے پچھلی دفعہ تو ایسے ٹوپس یہاں نہ تھے۔"

دوکاندار نے ان لڑکیوں کو اپنے مال میں دلچسپی لیتے دیکھا تو سیپیوں کے سارس بطخوں والا ایک بڑا طباق دکھاتے ہوئے بولا ——— "بی بی جی ——— دیکھئے محنت کی ہی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا۔ یہ سارس کا جوڑا دیکھئے کیا چھوٹی چھوٹی سیپیوں سے چونچ بنائی ہے دیکھو تو سہی ———"

"قیمت کیا ہے؟" مجو نے لیلیٰ اور شیریں کے کندھوں میں سے سر نکال کر پوچھا۔

"پانچ روپے حضور صرف پانچ روپے ———"

"توبہ مجو بھائی فضول چیز ہے بالکل ——— چار دن کی شو ہوتی ہے بالکل۔ پھر تو اتنے بوسیدہ لگتے ہیں یہ بگلے شگلے کہ توبہ ———" لیلی نے کہا۔

لڑکیوں کی پسند بھانپ کر مجو نے سیپیوں کے بنے ہوئے تین جوڑی کان

پھول علیحدہ کئے اور دوکاندار سے قیمت پوچھنے لگا تو زرقا بھی آپہنچی۔
"یہ ٹاپس کس کے لئے خریدے جا رہے ہیں؟" زرقا نے پوچھا۔
"تم تینوں کے لئے!——"
"ہم دونوں تو خیر لے لیں گی لیکن زکی آپا کے کانوں کی طرف تو دیکھئے"۔
——شیریں بولی زرقا نے شرما کر منہ دوسری طرف کر لیا تو مجو کو اُس کے کان میں کچھ چمکتی سی چیز نظر آئی اور بس۔
"زکی آپا کے کانوں میں جو ٹاپس اُس وقت ہیں ایک ایک کی قیمت دس ہزار ہے——"
"دس ہزار! توبہ میری" مجو نے کان کو ہاتھ لگا کر کہا۔
"سچ مجو بھائی ابا جی نے کویت سے بھیجے تھے——تین تین ہیرے ایک ایک ٹاپس میں ہیں۔ سچ" شیریں نے تفصیلی سمجھائی——
زرقا نے دوکان سے دور ہٹتے ہوئے کہا——"توبہ چپ بھی کرو۔ جو لینا ہے لو اور پھر چلیں"
لیلیٰ اور شیریں نے اپنے اپنے ٹاپس کانوں میں ڈال لئے اور سمندر کی طرف بھاگ گئیں اُن کے اڑتے ہوئے برقعے سمندری ہوا میں کالے بادبانوں کی طرح لہرائے سمندر کی ہوا جیسے بچھڑی ہوئی سہیلی کی طرح اُن سے ملی اور وہ کشاں کشاں ساحل کی طرف لپکتی گئیں——
زرقا کے قدم من من کے ہو گئے۔ اسے احساس ہوا پیچھے آنے والے اماں جی اور حبیب میرزا کی نگاہیں اُس پر جمی ہوئی ہیں۔ لہو کی گردش تیز ہو گئی اور کانوں کی لوئیں سرخ سرخ ہونے لگیں۔ ایسے ہی لمحوں کی یاد میں اس نے کئی راتیں سئور میں اکیلے ہی لیٹے لیٹے کاٹ دی تھیں۔ پچھلے خط میں مجو نے ان تینوں

بہنوں کو مخاطب کر کے لکھا تھا کہ کیا میں کراچی آؤں؟ تو اس کے جواب میں زرقا صرف ہاں لکھ سکی تھی۔ لیکن اس ہاں میں جیسے یار کو میہماں کرنے کا سارا خلوص اور نیک نیتی پنہاں تھی۔

زرقا جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی تو مجو بولا ——— "زرقا! اتنی جلدی کیا ہے؟ کون جانے یہ دوپہر، یہ تنہائی کے لمحے کبھی پھر ملیں نہ ملیں ———"

زرقا کی رفتار کسی نے باگ کھینچ کر ڈھیلی کر دی۔

"میرے خط مل جاتے ہیں ناں؟"

"جی ———" زرقا نے ہولے سے کہا۔

"کیا کروں اماں جی کے ڈر سے جو لکھنا چاہتا ہوں وہ لکھ نہیں سکتا" مجو نے جلدی سے کہا۔

زرقا نے مسکرا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"تیری خاطر مجھے گھر کے تمام افراد کو باری باری خط لکھنا پڑتے ہیں۔ یہ زیادتی ہے۔ میرے وجود پر بھی اور میرے جذبات پر بھی ———"

زرقا خاموشی سے چلتی رہی۔ وہ مجو کی ساری باتیں اپنے لوحِ محفوظ پر کندہ کرتی جا رہی تھی۔

"ذرا وہ تاپس مجھے بھی تو دکھاؤ جن کی تیریں اس قدر تعریف کر رہی تھی" مجو نے کہا۔

"وہ تو یونہی ——— فضول" زرقا کا گلہ رندھ گیا اور وہ جملہ ختم نہ کر سکی۔

"تم نہ دکھاؤ ہم نے دیکھ لئے ہیں۔ کبھی عورت کی زیبائش بھی چھپی ہے؟"

زرقا یکدم رُک گئی عورت کے متعلق کچھ بھی کہنا اس کے حضور میں بے ادبی کے مترادف تھا۔ مجو نے زرقا کا چہرہ اس لمحے میں کچھ اس طرح دیکھا کہ

یہ چہرہ ہمیشہ کے لئے اس کے ذہن میں جاگزین ہوگیا، ہلکی ہلکی لپ سٹک، خشک بال جو ڈھیلے ڈھیلے چوٹی میں سے نکل کر گردن پر پڑے تھے موٹی موٹی آنکھیں رونے کے بعد پانی کا چھینٹا لگانے سے سوج گئی ہوں۔

اور گردن کے آس پاس پھیلے ہوئے بالوں میں وہ چمکتے سے جگنو——

ان جگنوں کو زرقا کے کانوں سے چمٹا دیکھ کر مجّو کا جی چاہا کہ انہیں اپنی ہتھیلی میں یوں بھینچے کہ وہ اس کے گوشت میں اتر جائیں اور پھر لہو میں زرقا کے جسم کی حدّت بن کر گردش کرنے لگیں۔

"زرقا——!"

"جی!——"

"زرقا ایک چیز مانگوں دو گی؟"

"کہیئے؟——" گھبرا کر زرقا نے اس کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر اماں کی طرف نظر کی۔ گگو اور رانی اماں کو لئے گھونگھے والے کی دوکان پر کھڑی تھیں اور حبیب میرزا دوکاندار سے کچھ مول تول کر رہے تھے۔

"زرقا مجھے اپنے کانوں کے ٹاپس دے دو——"

"دونوں؟——" حیرت سے زرقا نے پوچھا۔

"چلو ایک ہی سہی——"

"آپ کو کیوں چاہیئے——؟" زرقا نے سوال کیا۔

"میں تمہاری نشانی رکھوں گا——"

زرقا کچھ پشیمان سی ہو کر بولی——"مجّو جی——یہ تو بڑے مہنگے ہیں اماں پہننے ہی نہیں دیتیں وہ تو میں نے آج زبردستی پہن لئے ہیں"

مجّو نے ہنس کر کہا——"تحفہ اور نشانی ہمیشہ مہنگی ہونی چاہیئے زکی

——— اس طرح اس کی وقعت دونی ہو جاتی ہے کچھ تو چیز کی قیمت کے باعث اور کچھ دل لگاؤ کی خاطر"

"آپ ——— آپ میرا رومال لے لیجئے ———" اس نے ریشمی رومال ڈرتے ڈرتے اس کی طرف بڑھانے کی کوشش کی مجو نے رومال لیا ناک کو لگایا۔ اس میں سے تیز سی خوشبو آ رہی تھی۔

رومال لوٹاتے ہوئے مجو بولا ——— "یہ رومال تمہارا نہیں ہے۔ اس میں سے کسی بدیشی سینٹ کی خوشبو آتی ہے" پھر اس نے ذرا رک کر کہا۔

"ٹاپس دے دیتیں تو میں اس کا ٹائی پن بنوا کر پہنتا ——— اور تمہیں دعائیں دیتا اور اگر کبھی پیسے کی کمی آجاتی تو اس کے دس ہزار وصول کر لیتا ———"

"ہائے اللہ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ!" زرقا روہانسی ہو کر بولی۔

مجو نے اونچا سا قہقہہ لگایا اور زور سے لیلیٰ کو آواز دی ——— "لیلیٰ لیلیٰ ٹھہر دبھئی میں بھی آ رہا ہوں ——— زکی بیگم تمہاری مجبوری ہے ورنہ جو چیز مجھے اچھی لگتی ہے وہ میں یوں اڑا لیا کرتا ہوں" اس نے چٹکی بجا کر زرقا کو دکھائی اور پھر ساحل کنارے مٹھائی کا لفافہ رکھ کر پتلون کے پائنچے اونچے کرنے لگا۔

سمندر سویا ہوا تھا۔ لہریں اس طرح آ کر ساحل کو چھوتیں جیسے کوئی بچہ ٹب میں ہاتھ ڈال کر لہریں پیدا کر رہا ہو۔ دھوپ کڑی تھی اور اگر ہوا نہ چلتی تو ساحل کنارے کافی گرمی ہوتی ابرق جیسی چمکتی ریت دور دور تک جگمگا رہی تھی۔ جب پانی کی لہر سمندر جانب بڑھتی تو یہ چاندی ملی ریت بھی بل کھاتی آتی اور پھر ساحل پر آ کر کسی تھکے ہوئے بچے کی طرح سو جاتی۔

لیلیٰ اور شیریں پہلے سے شلواریں اڑسے ٹخنے ٹخنے پانی میں کھڑی تھیں مجو کو اپنی طرف آتے دیکھ کر شیریں بولی ——— "لڑائی ہو گئی"

"چپ کر شیطان مجو بھائی آرہے ہیں" لیلیٰ نے کہنی کا ٹھوکا دے کر کہا۔
مجو نے ان دونوں کے نزدیک پہنچ کر ایک بار پلٹ کر دیکھا۔ زرقا ساحل کنارے بالکل تنہا کھڑی تھی۔ اس کا سیاہ چوڑیوں بھرا ایک بازو برقعے سے باہر تھا۔ سمندری ہوا میں دھاری دار قمیص اور برقعے کا نقاب اڑ رہا تھا مجو کو لگا وہ کہیں پردیس چلا ہے اور زرقا اسے الوداع کہنے آئی ہے۔ لیکن الوداع کے لئے اٹھنے والا بازو اٹھ نہیں سکا اور بے جان ہو کر گر گیا ہے۔

"آیئے مجو بھائی چلیں ——"

مجو لیلیٰ کی جانب آکر کھڑا ہو گیا۔

"میں تو آگے نہیں جاؤں گی یہیں ٹھیک ہے ——" لیلیٰ بولی۔

"یہ بہت ڈرتی ہے مجو بھائی قسم سے ——" شیریں نے کہا۔

"ڈر کاہے کا؟ ——" مجو نے پوچھا ——" جو لہر سمندر میں لے جاتی ہے وہ واپس بھی لاتی ہے سمندر دھرتی کی امانت ہمیشہ واپس کر دیتا ہے لیلیٰ ——"

"ہائے اللہ یہ زرقا آپا کیوں باہر کھڑی ہیں؟" شیریں نے کہا۔

پھر اپنی زبان میں اس نے لیلیٰ سے بات کی ——" میں انہیں لے کر آتی ہوں تم چلو ——"

مجو نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ قدم قدم پر اس کا رنگ پھیکا پڑ جاتا اور وہ مجو سے کہتی ——" بس مجو بھائی اس بار میں لہر کے ساتھ ہی واپس چلی جاؤں گی ——"

"تو تو بالکل چوہیا ہے لیلیٰ۔ میں نے تیرا ہاتھ جو پکڑ رکھا ہے" ——

"قسم مجو بھائی اب تو پانی گھٹنے گھٹنے آگیا ہے بھئی اب بس ——"

"ذرا سا اور چل پگلی ـــــ یہ ڈرنے کا احساس بڑا صحت مند ہوتا ہے۔ بس ذرا سا اور ـــــ"

جب لیلیٰ اور مجو پانی کی لہروں میں ہچکورے کھاتے واپس آئے تو شیریں اور زرقا ٹخنے ٹخنے پانی میں کھڑی تھیں۔ لیلیٰ کا چہرہ خوف سے گھبرایا ہوا تھا اور اس کی شلوار گھٹنے گھٹنے تک ریت اور پانی میں لت پت تھی۔ ساحل کے کنارے ککڑ اور رانی جوتیاں اتار رہی تھیں اور اماں جی ایک کرسی پر بیٹھی سستا رہی تھیں۔ حبیب میرزا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ شاید چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔

"توبہ زرقا آپا ـــــ اتنا زور کا پانی آتا ہے توبہ ـــــ" لیلیٰ چلائی شیریں پانی میں اچھل کر بولی ـــــ "مجو بھائی دیکھئے مچھلی ـــــ مچھلی وہ گئی ـــــ"

مجو نے مڑ کر دیکھا تو ایک لہر کے ساتھ ساتھ چند ایک گھونگھے اور ایک چاندی جیسی انگلی بھر مچھلی بہتی چلی آ رہی تھی۔ مجو اس مچھلی کے پیچھے پیچھے ساحل کی طرف چل دیا۔ مچھلی نیم مردہ ہو رہی تھی۔ جب لہر اسے ساحل کی وراثت بنا کر چھوڑ چلی تو اس نے اُسے اٹھا کر ہتھیلی پر رکھ لیا اور وہ اسے مٹھی میں دبائے زرقا کی طرف چلنے لگا۔ مچھلی اس کی بند ہتھیلی میں گدگدیاں سی کر رہی تھی۔ لڑکیوں کے قریب پہنچ کر اس نے مچھلی کو زرقا پر اچھال دیا اور وہ پانی میں گرتی گرتی بچی۔

"ہائے مجو ـــــ" وہ گلابی ہو کر بولی۔

"خوب مجو بھائی خوب" شیریں نے تالی بجا کر کہا۔

"آؤ شیریں پانی میں چلیں ـــــ" زرقا نے آہستہ سے کہا۔

لیلیٰ نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ـــــ "مجھے تو کوئی ایک لاکھ روپے دے تو بھی مجو بھائی کے ساتھ نہ جاؤں توبہ یہ منجدھار میں ہاتھ چھوڑنے والے

ہیں ـــــ" زرقا نے چور نگاہوں سے مجو کی طرف دیکھا۔

"سچ آپا ـــــ وہاں لیجا کر مجھے کہنے لگے جاؤ لیلیٰ میں آجاؤں گا تھوڑی دیر بعد ـــــ توبہ میرا تو کلیجہ اچھل کر حلق میں آگیا آپا ـــــ سچ!"

جیب میرزا کہیں سے سوڈے کی بوتلیں کھلوا کر لے آئے تھے اور ہاتھ کے اشارے سے انہیں بلا رہے تھے گگو اور رانی نے اپنی اپنی بوتلیں سنبھالیں اور بھاگتی ہوئی پانی میں آگئیں۔

رانی نے بڑی معصومیت سے پوچھا ـــــ "آپا ـــــ ہمیں بھی دکھاؤ مچھلی ـــــ کیسی مچھلی تھی مجو بھائی" مجو نے ہنس کر زکی کی طرف اشارہ کیا اور قدرے توقف کے بعد بولا ـــــ "تمہاری آپا نے دوپٹہ میں چھپا رکھی ہے یہ بڑی مچھلی ہے"

شیریں نے گگو کو کندھے سے پکڑ کر کہا "اسی لئے موتیوں والی فراک پہن کر آئی ہے کہ ریت میں اس کا ناس مارے؟"

گگو نے نظریں سوڈے کی بوتل پر جما کر بڑی سماجت سے کہا ـــــ "آپا سچ میں گہرے پانی میں نہیں جاؤں گی بھیگ گئی تو میرا ذمہ"

"رہے تم کہاں چلیں بڑی بی؟ ـــــ" شیریں نے لیلیٰ کو ساحل کی طرف جاتے دیکھ کر پوچھا۔

"جناب مجھے تو معاف کیجئے میں تو آرام سے سوڈا پیوں گی جیب بھائی بلا رہے ہیں کب سے"

بڑی شوخی سے مجو نے سوال کیا ـــــ "اور ہمارے ساتھ نہیں چلو گی پانیوں میں ـــــ"

"آپ زکی آپا کا حوصلہ بندھائیں، بھئی ان کا جو ہے ایسا دل ہے بلی کو دیکھ

کر دینے لگتی ہیں۔ ہم تو اب گیلی ریت کا گھروندا بنائیں گے۔"

لیلی ہاتھوں سے پائینچے اٹھائے اماں جی کی طرف چلی گئی زرقا اور شیریں ہاتھ پکڑے کھڑی تھیں۔ مجو گکوا ور رانی کے ساتھ مل کر مچھلیاں ڈھونڈنے میں مشغول ہو گیا۔ ہر بار جب لہر ساحل تک آتی اور چھوٹے چھوٹے گھونگھے سیپیاں اور ننھی منی چاندی جیسی مچھلیاں اپنی جلو میں لاتی تو تینوں اس کے پیچھے بھاگتے یہ مشغلہ کتنی ہی دیر تک جاری رہا۔ زرقا اور شیریں پانی میں کھڑے کھڑے سوڈا پی چکیں تو شیریں نے ساحل کی طرف آواز دی "حبیب بھائی آپ نمک ہیں کیا؟"

حبیب نے ہنس کر پوچھا ——— "میں سمجھا نہیں تمہاری بات شیریں۔؟"

" پانی میں اگر آپ کے گھل جانے کا امکان نہ ہوتا تو آپ بھی آتے ———

حبیب نے بڑی حریص نگاہوں سے زرقا کے ننگے ٹخنوں کو دیکھا اور پھر پتہ نہیں کیا مصلحت جان کر چلایا ——— "تم لوگ ہو آؤ میں اماں جی کے پاس بیٹھا ہوں ———"

اماں جی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر شفقت بھرے لہجے میں بولیں

" تم بھی کھیل کود آؤ"

" آپ چلتیں تو میں بھی چلتا ———"

" بھئی میں تو پیروں کی وجہ سے معذور ہوں ادھر پانی میں اتری ادھر ان میں درد اٹھا" حبیب نے پایاب پانی میں کھڑی زرقا کو کنکھیوں سے دیکھا اور لمبی سانس بھر کر بولا ——— "مجھے بھی کوئی ایسا شوق نہیں!"

گکوا ور رانی تو ساحل کنارے تھوڑے پانیوں میں کھیلتی رہیں لیکن شیریں زرقا اور مجو گہرے پانیوں کی طرف چلے۔ شیریں درمیان تھی ایک جانب مجو نے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور دوسری طرف زرقا نے۔ جب یہ تینوں گہرے

پانیوں کی طرف چلے تو مجو نے ایک بار زرقا کا ہاتھ پکڑنے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔ لیکن زرقا کو یوں لگا جیسے اماں جی سوڈے کی بوتل کے اوپر سے سیدھی اس کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ وہ جلدی سے ہٹ کر شیریں کی طرف ہو گئی۔

جب وہ تینوں واپس ہوئے تو رانی اور گگو نے پھر چلا کر مچھلیوں کی آمد کا مژدہ سنایا۔ زرقا ہولے سے بڑبڑائی ——— "ہائے چھوڑیے بھی مچھلیاں ——— مچھلیاں کوئی تک بھی ہے ———"

وہ تینوں پایاب پانی میں کھڑے تھے۔ ابرق جیسی چمکتی ریت ساحل کی طرف بڑھنے والی ریت میں بل کھاتی پارے کی طرح جگمگاتی بڑھتی جا رہی تھی۔ یکدم کسی بہت ہی چمک دار چیز نے عین زرقا کے پیروں تلے شکل دکھائی اور پھر بل کھاتی ساحل کی طرف چلی

"کیسی چمکدار مچھلی ہے ——— میں تو اسے ضرور پکڑوں گا۔"

مجو نے اس چمک دار مچھلی کے تعاقب میں بڑھتے ہوئے کہا۔

لیکن شیریں نے پتنگ کی ڈور سمجھ کر جیسے اس کا ہاتھ کھینچا اور بولی ———

"واقعی آپ تو بچہ ہیں مجو بھائی مچھلی پکڑنے سے کیا ہوتا ہے! ———"

"ہوتا ہے کچھ ——— جب مچھلی ہتھیلی میں گدگدی کرتی ہے تو عجب اضطراب سا ہوتا ہے ———"

مجو بولا۔

"بس اس بار تو میری اور آپا کی خاطر نہ پکڑیئے ———"

"بہت اچھا سرکار ہم تو حکم کے غلام ہیں!"

چمکدار مچھلی ساحل تک گئی وہاں چند لمحے رکی پھر پلٹنے والی لہر میں بل کھاتی لہراتی خدا جانے کہاں غائب ہو گئی۔

زرقا نے ساحل کی طرف جاتے ہوئے سر پہ دوپٹہ کر لیا اور آہستہ سے بولی ——— "توبہ ہوا بھی یہاں کتنی ہے دوپٹہ سر پہ ٹوٹکتا ہی نہیں ذرا اپنے بالوں کی پن دینا شیریں میں ذرا دوپٹہ ٹکا لوں ———"

زرقا سر پہ پن کے ساتھ دوپٹہ اٹکاتی واپس ساحل کی طرف جا رہی تھی اور اس کے بائیں کان کا ننھا سا ٹاپس ابرق جیسی ریت میں بل کھاتا لہراتا آزادی کے گیت گاتا سمندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔

دور دور تک سمندر محو رقص تھا۔ اُسے معلوم نہ تھا کہ اس اکیلے ٹاپس کی قیمت دس ہزار ہے۔

سمندر کے ناچ کو نہ تو طبلے کی تھاپ کی ضرورت تھی نہ سازوں کی ہم آہنگی کی اس کے اپنے سینے کو چیرتا، دھڑکتا، لہکتا ایک ایسا نغمہ موجزن تھا جس کے زیر و بم پر کسی مشاق رقاصہ کی طرح وہ ہولے ہولے قدم بڑھاتا ننھی ننھی ٹھوکریں مارتا تھیا تھیا کرتا وہ ساحل کی طرف بڑھتا۔ پھر بڑے نامعلوم انداز میں اس کی چال تبدیل ہو جاتی۔ ننھی ننھی ٹھوکریں بھرپور ادائیگی سے بوجھل ہو جاتیں اور وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کر بڑی گھن گرج کے ساتھ ترشول کھینچ کر شو شمبھو شو شمبھو کرتا مٹیالی اور سنہری ریت کو اپنی جلو میں لپیٹتا ساحل تک پہنچتا۔ اُس کے پلوؤں میں گھونگھے سیپیاں، ننھی ننھی مچھلیاں بندھی ہوتیں۔ پھر ان تحفوں سمیت وہ ساحل کی دیوی کے سامنے آرتی اتارنے کے لئے آکھڑا ہوتا تو اس کا سارا طمطراق ساری اکڑ اور اشانتی بنیتی میں بدل جاتی۔ وہ ہاتھ جھکا کر گھٹنوں کے بل ساحل کی دیوی کے سامنے سرنگوں ہو جاتا پلّے سے بندھے ہوئے گھونگھے سیپیاں اور ننھی ننھی چمکدار مچھلیاں ریت پر بکھر جاتیں اور وہ سر نیہوڑائے تر آنکھیں لئے چھوٹے چھوٹے قدم دھرتا یوں لوٹ جاتا جیسے اس نے ساحل کی دیوی کے قدم چوم کر اس کا اپمان کیا ہو ——— یہ رقص روزِ ازل سے جاری تھا۔ روزِ ازل سے

ساحل کی دیوی ویسے ہی بیٹھی تھی۔ وہ نہ تو بے نیاز ہو کر لوٹ رہی تھی اور نہ ہی اس نے بازو پھیلا کر کبھی سمندر کو گلے لگایا تھا۔

سمندر کے پھیلائے ہوئے گھونگھے سیپیاں اور ننھی ننھی چمکدار مچھلیاں ساحل کی دیوی کے قدموں میں دھری تھیں ——— لیکن ایک تحفہ سمندر بھی ساحل کی دیوی سے چرا کر لے گیا تھا۔ اُس کی لہروں میں ابرق جیسی ریت میں چمکتا بل کھاتا لہراتا آزادی کے گیت گاتا ایک ٹاپس ان گہرائیوں کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کی اتھاہ کو خود سمندر نہ جانتا تھا۔

❊ ❊ ❊

لیلیٰ نے گیلی ریت میں سے اپنے دونوں پاؤں نکالے۔ دو کھلے دروازوں والا سیلہ گھروندہ بھدی ناک کی طرح ٹکر ٹکر جھانکنے لگا۔ کچھ ہی دور بے روغن کی میز کرسی پر اس کی بہنیں بیٹھی تھیں چائے کا دور چل رہا تھا۔ مٹھائی کے وہ لفافے جو حبیب میرزا صبح لایا تھا اب خالی ہو کر ریت پر پڑے تھے۔ مجو بھائی نے جیب میں سے تاش نکال لیا تھا اور وہ اسے پھینٹ پھینٹ کر چابکدستی سے پتہ غائب کر رہے تھے۔ کبھی وہ رانی سے پتہ نکلواتے کبھی اماں جی سے کبھی حبیب میرزا سے ——— شیریں اور ککو اور لیلیٰ ہر بار بے ایمانی سے دو دو پتے نکالتی تھیں۔ اس لئے اب وہ ان کی طرف نہ بڑھتے تھے۔ ہاں جب کبھی وہ زرقا کی طرف جاتے تو جیسے تاش کے بجائے ان کے ہاتھوں میں ان کا دل ہوتا اور وہ زکی کے سامنے اسے پیش کر کے کہتے "زکی کوئی پتہ نکال لو ——— ساری تاش تمہاری ہے!"

زکی بڑی آہستگی سے بغیر مجو کے ہاتھ کو چھوئے ایک پتہ نکالتی اور میز پر رکھ دیتی ——— پھر لمحہ بھر کو کھیل رک جاتا۔ مجو تاش پھینٹتا۔ پتے الٹ پلٹ

کر دیکھتا اور جب وہ زکی کا پتہ بتانے کے لئے اس کے کان میں سرگوشی کرتا تو وہ پتے کی بات ہی نہ ہوتی ——

ہر بار جب مجو زکی کے کان میں پتہ بتانے کے لئے جھکتا تو لیلیٰ اپنے گھروندے کی طرف دیکھتی اور پھر اسے لات مار کر توڑ دیتی ——

ابھی کل تک وہ بالکل بچی تھی۔ اس نے دو چوٹیاں کر لی تھیں لمبے کرتے اور کھلے پائنچوں کی شلوار پہن لی تھی فسٹ ایئر میں پڑھتی تھی لیکن اس کی ذہنی عمر ککو اور رانی جتنی ہی تھی آج وہ سمندر کے گہرے پانیوں سے اپنے وجود کا احساس اور عجب قسم کی تنہائی کا روگ سمیٹ کر واپس آ گئی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ہفتے کی شام اور اتوار کی شام میں کل چوبیس گھنٹے کا فرق ہے لیکن ابھی چوبیس گھنٹے پہلے میں کتنی خوش تھی۔ مجھے اپنے کپڑوں سے عشق تھا مجھے اپنی پروفیسروں سے محبت تھی —— مجھے زندگی کی ہر گھڑی ہر لمحہ عزیز تھا۔ اور آج کل چوبیس گھنٹے بعد زندگی نے جیسے چولا بدل کر خاکستری روپ دھار لیا تھا اس میں نہ کوئی خوشی تھی نہ کوئی غم تھا۔ ایک سوگوار خالی خولی کیفیت تھی اور بس!

اس روگ کی وجہ کچھ مجو بھائی نہ تھے —— یا شاید وہ یہی سمجھتی تھی۔ یہ روگ تو اس آگاہی سے پیدا ہوا تھا کہ اب زندگی پہلے سی نہیں رہی۔ اب راتوں کو خواہ مخواہ اس کی نیند کھل جائے گی اور اسے احساس ہو گا کہ اس کا دل سمندر کی مانند ہے اس میں چاروں طرف سر مارنے والی لہریں ہیں لیکن کسی میں بھی اتنی سکت نہیں کہ وہ آسمان پر چمکنے والے چودھویں کے چاند کو چھو سکے —— اسے آج پہلی بار زکی آپا پر رشک آ رہا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اگر انسان کسی کے مضبوط اور گرم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سمندر میں اتر بھی جائے تو بھلا خوف کیسا؟

اس طرح اترتے اترتے لوگ سیپیوں میں بند ہو کر سمندر کی تہہ میں جا اترتے ہوں گے اور پھر؟ ——— پھر؟

پتہ نہیں مجو بھائی کے ہاتھ کا گرم لمس اس کی آگاہی کا باعث ہوا یا کسی نہ کسی دن انسان کو جاگنا ہی ہوتا ہے۔

ایک بار پھر زکی کے کان میں جھک کر مجو نے اس کا پتہ بتایا۔

اور ایک بار پھر لیلیٰ نے سیلی مٹی کے گھروندے پر لات ماردی۔

دور سے کوئی بیسویں مرتبہ شیریں نے چلا کر کہا ——— "اب آجاؤ لیلیٰ یہاں بڑا مزہ ہو رہا ہے ———" اور اس کے اندر خوشی کے خلاف احتجاج کرنے والی پہلی صندنے پکارا ——— "تم مزے کرو ——— میں یہاں بہت خوش ہوں۔"

پھر حبیب میرزا اٹھ کر لیلیٰ کے پاس آگئے۔ وہ اس گھر کے ملاح تھے جب کسی کشتی کو الگ تھلگ دیکھ پاتے تو جھٹ وارد ہو جاتے۔ اب بھی آکر انہوں نے پوچھا ——— "کیوں لیلیٰ چلتی کیوں نہیں؟"

"مجھے ریت کے گھروندے بڑے اچھے لگتے ہیں حبیب بھائی"

حبیب بھائی ہنس کر بولے ——— "خیر اگلی اتوار پھر سہی وہاں پکچر کا پروگرام بن رہا ہے سب تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں ———" لیلیٰ نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور سیلی مٹی میں اپنے پیروں کے نشانات پر نظر جمائی ——— جگانے والا ہاتھ چاہے کسی کا ہو تا گرم ہے۔

اس کے جی نے آہستہ سے کہا یہاں سے آج ریت کے گھروندے بنانے کا کھیل ختم ہوا ——— گھروندا ایسی چیز نہیں جسے انسان اکیلا بنا سکے۔ اور جو گھروندے اکیلے بنتے ہیں وہ ہمیشہ کمزور ہوتے ہیں!

kitaabiyat.pk

زرقا کے کمرے میں سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی پوری کھلی تھی اور گلناری پردے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اندر تیز بلب روشن تھا اور کھڑکی میں سے روشنی کا تختہ اتر کر اندھیری رات میں سوئی ہوئی سڑک پر اجالا کر رہا تھا۔ لیلیٰ کا پلنگ کھڑکی کی ایک جانب اور زرقا کا پلنگ دوسری جانب تھا۔ اماں جی کے کمرے میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ عین الماری کے ساتھ شیریں کی چھوٹی سی چارپائی بچھی تھی۔ ڈرائینگ روم میں کھلنے والے دروازے کے پاس تینوں بہنوں کے ٹرنک اوپر تلے رکھے تھے اور ان پر سفید غلاف بڑے قرینے سے بچھے تھے۔

سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے سامنے وہ چھوٹی میز بھی پڑی تھی جس پر لیلیٰ اور شیریں اپنی کتابیں رکھتی تھیں، اور جس پر کہنی ٹکا کر زرقا اس وقت سڑک کو دیکھا کرتی تھی جب مجو کے آنے کا وقت ہوتا۔ لیلیٰ اپنے پلنگ پر بیٹھی سلیپروں میں سے ریت جھاڑتی ہوئی بولی ——— "مجھے تو ایسی ہی فلمیں اچھی لگتی ہیں بس۔"

زرقا اپنے پلنگ پر ان کی طرف پشت کئے بیٹھی تھی اور رات کی قمیص پہن رہی تھی۔ گلے میں سر ڈالتے ہی اس نے چمک کر لیلیٰ کی طرف دیکھا اور ڈانٹتے ہوئے کہا ——— "ایسی فلمیں اچھی لگتی ہیں عریاں، فحش!" شیریں نے ان کی باتوں میں ذرا بھی دلچسپی نہ لی اور شیشے میں منہ دیکھ دیکھ کر چہرے پر کریم ملتی رہی۔

"آپا ——— بھلا آپ عریانی کسے کہتی ہیں؟" لیلیٰ نے پوچھا۔

"تو کیا عریانی صرف جسم کی ہوتی ہے۔ جذبات کی عریانی بھی اتنی ہی شرمناک ہوتی ہے لیلیٰ۔"

لیلیٰ نے اپنی چوٹیاں کھولتے ہوئے کہا ——— "آپا! زکی آپا میں پوچھتی ہوں آخر کیا بات تھی ان جذبات میں؟"

"کم از کم یہ امریکن فلمیں بہت فحش ہوتی ہیں"

آپا! ——— تو آپ کو وہ فلمیں اچھی لگتی ہیں جن میں تین تین منٹ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گانے گائے جاتے ہیں۔ پھر دو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگا جاتا ہے۔ اور پھر بھی ہیرو ہیروئن ایک دوسرے کے قریب آکر یوں ہر یک لگاتے ہیں گویا ایک دوسرے کو چھونے کی خاطر انہوں نے تعاقب کیا ہی نہ تھا جیسے چھونا گناہ ہو؟"

"گناہ نہیں تو اور کیا ثواب ہے؟" زرقا لیلیٰ کی دیدہ دلیری پر حیران ہو کر بولی۔

"ہائے بند کرو یہ بحث توبہ ——— سینما گھر سے آپ دونوں چھڑی ہوئی ہیں" انگلیوں سے رخساروں کی مالش کرتے ہوئے ثریں نے کہا۔

لیلیٰ نے اس کی پروا نہ کی۔ آج ہی تو اس نے زندگی کا اتنا بڑا راز پایا تھا۔ آج ہی تو پہلی بار اس پر آگہی کا دروازہ کھلا تھا۔ اس نے بڑے رعب سے کہا۔

"آپا۔ آپا میں تمہیں کیسے سمجھاؤں؟ مجھے سمجھانا نہیں آتا۔ لیکن جو کچھ میں سمجھتی ہوں آپا وہ..... وہ یہ ہے کہ کئی لمس ایسے ہوتے ہیں جو بڑے پاک ہوتے ہیں بیحد اور کبوتر کی طرح گرم ہوتے ہیں"

"اور اس فلم میں جو چوما چاٹی تھی وہ بھی طیب تھی کیا" زرقا نے سرہانے پر سر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"خدارا بتی بجھاؤ یہ کیا بک بک جھک جھک ہے" ثریں لیٹتے ہوئے بولی۔

لیکن لیلیٰ پلنگ پر بیٹھی رہی۔ اسے آپا کی ذہنیت پر ترس آ رہا تھا۔

"آپا یہ اُن کا کلچر ہے"

"کلچر کی آڑ لے کر ان کی محبت روحانیت سے خالی ہو چکی ہے ——— زرقا

نے جوش میں آکر کہا۔

"محبت کبھی روحانیت سے تہی نہیں ہوتی آپا چاہے کچھ بھی ہو ــــ"

زرقا کہنی ٹکا کر بیٹھ گئی اور بولی ــــ "لیلیٰ تم ابھی فسٹ ایئر میں ہو تمہیں ان باتوں کی سوجھ بوجھ نہیں میں جانتی ہوں کہ روحانیت صرف مشرق کے ورثے میں آئی ہے۔ صرف مشرق کی محبت پاک ہے۔"

"آپا تم تیاگ کی باتیں کر رہی ہو مشرق کی محبت تیاگ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں" آج خدا جانے لیلیٰ کو یہ باتیں کیسے سوجھ رہی تھیں ابھی کل تک وہ تیاگ جیسے لفظ کا استعمال تک نہ جانتی تھی۔

"یعنی تم تیاگ کا تمسخر اڑا رہی ہو اپنے بھائی" زرقا بھی لیلیٰ کی باتوں پر حیران ہو رہی تھی۔

لیلیٰ جھلا کر بولی ــــ "تیاگ کا تمسخر کون اڑا رہا ہے آپا لیکن آپ محبت کی مادی برکتوں سے کیوں منکر ہیں" زرقا لیلیٰ کی بحث سے تنگ آچکی تھی اس نے آنکھیں موند لیں اور سوچا۔ لیلیٰ بھلا اس محبت کو کیسے سمجھ سکتی ہے جو ہمیشہ سلگتی ہے سلگتی ہے اور سلگتی ہی چلی جاتی ہے۔ ایسی محبت جس کا دوسرا نام انتظار ہے ایسی محبت جو ایک طرف سہمی ہوئی اس لئے کھڑی رہتی ہے کہ کہیں ملوث ہاتھ اس کی روحانیت کو تباہ نہ کر دے ــــ وہ محبت جو وصل سے اس لئے ڈرتی ہے کہ اس کی تپسیا کا رنگ بھنگ نہ ہو جائے ــــ بھلا جب لیلیٰ یہ باتیں ہی نہیں سمجھتی جب لیلیٰ نے پانچ سال اس آگ میں سلگ کر ہی نہیں دیکھا تو وہ میرا نقطۂ نظر کیا خاک سمجھے گی۔

لیلیٰ نے بند آنکھوں والی اپنی بڑی بہن کی جانب دیکھا۔ وہ کتنی خوبصورت لگ رہی تھی گلناری پردوں کی سرخی مائل حدت اس کی جلد پر آتشیں غبار پھیلا

رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے رخساروں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ گردن کی سفید صراحی میں ایک رگ پھڑک رہی تھی کسی بلوریں مینا میں شہد کی دھار اتر رہی تھی۔ لیلیٰ کا جی چاہا کہ اپنی بہن کے اس شہد آگیں گلے پر اپنے لب رکھ دے اور پھر اتنا روئے اتنا روئے کہ اس کی ساری تنہائی ساری اداسی ان آنسوؤں میں بہہ جائے۔ وہ اپنے پلنگ پر سے آہستہ سے اٹھی۔

شیریں نے چڑ کر ان کی طرف پشت کر لی اور چلّا کر کہا —— "ہائے توبہ بند کرو بتی خدا قسم تم لوگوں کو تو کسی اور کا دھیان ہی نہیں۔"

لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کی بڑی بہنوں پر کچھ اثر نہیں ہوتا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں —— اور پھر تھوڑی دیر بعد سو گئی لیلیٰ آہستہ سے اٹھ کر زرقا کے پلنگ پر جا بیٹھی تو گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"بس اب سو جاؤ لیلیٰ میں بہت تھک گئی ہوں۔"

لیلیٰ زرقا کے دائیں بائیں ہاتھ رکھ کر اس پر جھک گئی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی —— "آپا —— ایک بات کہوں؟"

"کہو!——" گھبرا کر زرقا نے نگاہیں جھکا لیں۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"آپا کبھی کبھی تو تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو کہ میرا جی چاہتا ہے تمہیں چوم لوں —"

زرقا معصومیت سے ہنس پڑی۔

"آپا —— برا تو نہ مانوں گی؟"

"کہو ناں؟"

"آپا —— تم مجھے اتنی پیاری لگتی ہو تو کیا مجو بھائی کا جی نہ چاہتا ہو گا کہ ......"